

# آفاقِ نوا



شفیق فاطمہ شعریٰ

---

ناشر، شالیمار پبلیکیشنز، حیدرآباد ۳۶ (۱۷ پی)

---

# سلسلہ مطبوعات

## نمبر ۶۰

آفاقِ نوا	.....	نام کتاب
شفیق ناطمہ شعری	.....	شاعرہ
تقیہ مہاجر	.....	زیر اہتمام
شایمار پبلیکیشنز، حیدر آباد ۳۶ اے پی	.....	ناشر
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد ۲	.....	طباعت
قیمت درمست	.....	سرورق ڈیزائن
نندنی آرٹ پرنٹنگ پریس، حیدر آباد	.....	سرورق طباعت
تہمت	.....	تعداد
۱۹۸۷ء	.....	سنہ اشاعت
۳۰ روپے	.....	

(میلے کے پتے)

- \* شایمار پبلیکیشنز - ۲۸۷ بی نیامک پیٹ، حیدر آباد ۳۶ اے پی
- \* شفیق ناطمہ شعری - ۷۲ اے نیامک پیٹ، حیدر آباد ۳۶ اے پی
- \* نیشنل بک ڈپو - چارمینار - حیدر آباد ۲
- \* مکتبہ جامعہ - دہلی - بمبئی - علی گڑھ
- \* سید محمود خاں - ملیر سٹی - ملیر - کراچی پاکستان

# انتساب

والدہ مرحومہ

ظفر النساء بیگم کے نام

کن انجلنے افقوں پر

تابندہ جلیں ہے

دھول بھرے آنگن کا وہ چاند

اک پیر سوز تبسم جس کا

میکے پاس امانت ہے

# فہرِس

۷	پیشِ لفظ
۱۱	شہرِ نوا
۱۵	شجرِ تمثال
۲۳	کھیلِ رتوں کا
۲۸	لب کش
۳۱	ارضِ موعود
۳۲	رَتِ مالا
۳۹	بازِ گشت
۴۲	شبِ نامہ
۴۷	امیرِ جامہ ، ذاکرِ صاحب کی یاد میں
۵۰	شفیعِ الامم
۶۹	افتادِ گاہیں نجوم کی
۷۸	بہتا پانی
۸۱	فجرِ کا الاء
۸۶	نرمل سیٹھی پانی کی تلاش
۹۲	جادہ رسائی
۹۶	سلامتِ سبوحہ تیرا ساقیا
۱۰۰	فدایتِ نمودِ خواب

# پیش لفظ

سیارے گردش کرتے رہیں گے  
ستاروں کے اطراف

اور ہم  
اپنے ناموں اور سراپاؤں کے ساتھ  
تیرے نام  
اور تیرے سراپا کی  
جھک لکھتے رہیں گے

شبِ قدر کے آسمان سے  
چھال چمڑے پیر اترے ہوئے حروف  
یادداشت میں  
طلوع و غروب کا کھیل کھیلتے رہے  
جو لفظ ان کی درو بست سے بنا

اس کامرکزی روشن نقطہ  
اس کا سادہ سیج مفہوم تھا

فنا کا دھڑکا تھا  
جس کی لگاتار ضرب  
وجود کی روپ ریکھا تراشتی رہی  
چاہت کی رُت میں  
ارمان کی بے اختیاری کے آگے  
بند باندھتا ہوا  
فنا کا دھڑکا تھا

آتشِ دل کو مزید ہوا دینے والا  
اڑتے ہوئے وقت کے نشانہ  
کہیں ایک لمحہ کی شکل میں  
کہیں برسوں اور صدیوں کے  
پیچیدہ الجھاؤ کی صورت میں  
انسان کی رفتار پر گواہی دیتے ہیں  
شعور کی سطح پر  
اپنا اثبات کرنا  
جس کی ذمہ داری ہے

مشاعر کا من  
کسی ایسے دلیرانہ - ڈھیٹ اقدام پر  
للیچا اٹھتا ہے  
جیسے کہ

گھاس پھوس اور پتوں سے ڈھکا گڑھا  
اپنی پیش قدمی سے پاٹنا  
یہاں تک کہ درختوں کے سمجھے سے  
سردھائے ہوئے ہاتھیوں کے غول برآمد ہوئے  
اب صدیوں تک ہم جو کچھ بھی لکھیں گے  
وہ ایسا ہوگا  
جیسے صدیوں سے زمینیں  
بجڑ پڑی ہیں

اختتام  
کار ہائے مابہ پایاں نارسیدہ  
درد و داغ آرزو، درماں نہ دیدہ

دستخط  
ناظم سحر  
۶۸۷/۱۲/۲۸

# شہرِ نوا

بس گہر و نواح میں مہکی تھی  
 وہ نشہ بہ لب لالے کی کلی  
 پتی پر لپٹی پتی سرکاتی  
 اہ ہستہ خرام سنہری دھوپوں میں  
 اک پوری رت کا خم اُس کے

امرت سے بھرا

ایک پوری رت ڈنڈی ڈھلکانے  
 پتکھٹیاں بکھرانے کو درکار ہوئی  
 سب چمن چمن گل حوض لبالب، سائے گھنے  
 جھونکوں کی صورت کی، رواں دواں



اُفتادہ بظاہر سب راہیں  
 رہتی ہیں پیہم سرگرداں  
 سب اگلے پچھلے یگ  
 سب بستے اُجڑتے گاؤں، نگر  
 شرنا رہی، نزواسی  
 پیہم دہراتے ہوئے  
 وہ لہیتی باتیں  
 جن کا کوئی اُنت نہیں

پیڑھی پیڑھی کا لکھ پیتی  
 ان راہوں پر  
 چلتے چلتے تلوے پتھر جاتے ہیں  
 پتھر ابٹ  
 دھیرے دھیرے ہستی کا ظاہر، باطن سب لیتی ہے نگل  
 آنکھیں ساکت  
 آنسو جم جاتے ہیں

جب کوئی نہ ہو  
 جب سایہ شاخِ گل افعی بن کر رہینگے  
 ہر آہٹ کے نادیدہ ہاتھ میں چاقو کا پھل کھلا ہوا  
 رہ رہ کر چمک اٹھے

تب کون ہے یہ  
 شانے پر نرمی سے رکھا جانے والا  
 ایک ہاتھ ..... کہیں یہ  
 خسرو کا نغمہ تو نہیں  
 اک پل سبجوگ زمانوں کا

حانوں کا اور ارمانوں کا  
 جھرنابن کر پتھر سے پھوٹ پڑا  
 یہ اپنی آنکھیں  
 کتنے دُور دراز زمانوں میں  
 کھل سکتی ہیں  
 پانی اس چھاؤں کا ٹھنڈا رخ  
 پانی میں بسی کوزہ کی سنگینہ

مرہم زخمِ جگر کا  
 اور کاری اتنا  
 یہ اپنی آنکھیں کتنے دُور دراز  
 زمانوں میں کھل سکتی ہیں  
 سب کچھ ویسا ہی جیسے سچِ مح کا  
 ذی نفس، کشادہ، گرد و پیش  
 تعمیریں اُجلی اُجلی

جادوں میں  
 ہر آن اُجاگر، اوجھل، ارض و سما  
 اس گرد و نواح میں اُترا تھا  
 اک شہرِ نوا  
 وہ ایک سہمے کا دیپ، سہمے کی آندھی میں  
 جلتا تھا یہاں  
 اس میں جتنا بھی شامل تھا

محلوں کا فیصلوں کا حصہ  
 نابود ہوا

نابود ہوا جاتے ہیں پیہم  
 قتلِ عام کا خط

لشکر گاہوں کا رقبہ  
 قسروں کا اثاثہ  
 پورب کا آہنگ یہ جانا پہچانا  
 اک نرم تمازت، بسنت رت میں  
 رچی ہوئی

جب جب میں لالی کہتی ہوں  
 اک سورج زیرِ خطِ افق  
 محبوب ہوا جاتا ہے جیسے اک عالم  
 ہو اس کی طرف انگشت نما  
 تھم جاتے ہیں پل بھر کو تو اگر سفرِ نصیب  
 یہ کس ساگر کی پروردہ بدلی ہوگی  
 کتنی جاں لیو امسا فیتن طئے کر کے اسے  
 اس وادی کے دامن میں بلا  
 ہنگام ..... برسنے کا

# شجرِ تمثال

مٹی اچھوتی

اس میں گندھی ہے

بدی سلونی اور رات کالی

جبس بھی ہے کس بھی

اس کی تہوں میں

فولاد کا زور مھیولوں کا رس بھی

جوشِ نو میں شق جا بجا سے

باڑھیں منڈیریں ناپید

ٹیلے حدِ اُفق تک

پگھلے سمنے کی ہر سی سنہری

یہ گھاس بن ہے یاد صوب کا سیل

گھل بل گئے ہیں اس میں ہمارے بہتے نفس بھی

یہ بھاگ والی مٹی !

ابھی تک

اس کا اگم ہے سورج کی لال

تتلی کی پرواز

وحشی ہوا کے ریلے میں خود پر قابو نہ پائے

بہتی چلی جائے

بے سمت بے سود

تب اک سہرا ننھا سا بوٹا

اُبھرے پکارے

اس سے اُلجھ کر کچھ دیر کا پنیں بکھرے ہوئے پر

پھر شانت ہو جائیں

کتنا غنیمت نازک سہارا

اتنی سی اک بات

اور اس پہ دیکھو

ٹیلوں سے آفاق تک گھاس بنیں

دھیمی سی شورش لردہ جگائے

پار بنیوں کو برگد کی تھامے

بُتا بن گئے ہم

اس کی جڑیں ہیں گہری زمیں میں

یہ اصلیت ہے

ہم ایک سپنا

سوچوں سے اُجکے 'سوچوں میں ڈوبے

ہم اوس کی بوند

اک پنکھڑی پرنگ بن کے روشن

زرفام کریں

دیکھیں تو چونکیں

راوہو یہ آرام !

زرفام کریں

چمن چمن کے ہم کو

برناسویروں کے آنچلوں میں

ٹانگیں سجائیں

جتنے ہوئے درر

اتنے ہوئے نور

حد فاصلوں کی بڑھتی ہی جائے

کتنا یہ چپا میں

بسرانہ پائیں

پہر بھول جائیں

اچھڑی پرنگ بن کے روشن رہنے کے سُکھ کو

کس زور کس شور سے بہہ رہا ہے  
بے سدھ کنار

اس میں تو ہر شے  
سیال بے حال  
سمتوں کا اُبھاؤ

اندھ ہوا کف

رشتوں کا پھیلاؤ  
اُڑتا ہوا جھاگ  
بر طمعتی ہوئی رُو  
چر ممتی ہوئی رُو  
دریا سے ساگر  
ساگر سے ساگر  
(یہ بات کیا تھی ؟)

اگلا کنار  
پچھلا کنار  
غرقاب سب کچھ  
یہ بات کیا تھی



کیا اس میں سکھ ہے  
بلے چین جاں کا ؟

دل ایک دھیے دکھ کا جوالا  
سلگے پکارے  
ہم بھی عجب ہیں  
دوری میں کامل  
بسرادے کی دھند میں ٹمٹماتے  
بے نام تارے

ہم بھی عجب ہیں  
پیر واز شعلہ  
پھوٹے سدا کوہ چھلانشمین  
رفتار۔

اندھا دھند، اپنی ہی رفتار

یوں راہ مارے

اک جل پری سی آئینہ رولہر  
خود میسری آواز  
گاتی رہی : "جل دھونی ہے دھونی

صندل تھے بھولے بسرے کنارے  
ہیزم ہے سب کچھ

شاخوں شگوفوں پھولوں کے زینے  
خوشبوؤں کے بام  
گم گشتہ سطحیں  
ان گھر چٹائیں  
جوان سے اوپر اٹھ جائیں  
وہ سنت!

وہ بتا ، وہ اصنام  
گاتی رہی ، " تم ہیزم میں شعلہ  
میں نے کہا پھر  
تیرا ثمر کیا ؟  
کالا دھنواں ؟  
یا — سونا فیتلا ؟  
یہ بات کیا تھی  
کیا اس میں سکھ ہے  
بے چین جاں کا ؟

سونا فیتلا

— باتوں کے پیچاک

اور آس دل کی

اک کلمہ پاک

اس کی جڑیں ہیں گہری زمیں میں  
شاخوں کا چھتھنار آکاش میں گم  
ہر یگ کے جھونکے میں نوشگفتہ

سر سبز خوشبو

گھلتی چلی جائے

صاحب نوا کے ہجہ میں آباد

موصوم ارمان ان ہوشیوں کا

دھانی بسنتی اطراف و اکناف میں

ہن بکھیرے

یہ خوش اساسی

اٹھا اسی سے

بالیدگی کا اٹھاؤ —

لے انت نامی تسلسل

گونگا نندا سادھندا ساک نل

جیسا ملک نہ کھو جے

یہ دوار اپنی سونی گھٹی کا  
اک ذات — آغاز اور منتہا

اک پورا سراپا  
تب تک نہ ابھرے آواز  
تب تک  
اداز کی گونج واپس نہ آئے

ہر فاصلے کے پتے جگمگ ہیں

تب تک نہ جاگے وہ سطح شیریں

جو اک نفس کی پورب دشا میں  
دوجے نفس کی ہندی رچائے

# کھیل رتوں کا

اک رُت آئے اک جائے  
ہم رُت رُت چو نکس  
کروٹ بد لیں سو جائیں

معصوم گلاب پھواریں

بے لفظ تخیل

بادل چمکیلے سفینے

میدان ٹھہرا ہوا پانی

سائے وہ جزیرے دھانی

اجلی شادابی آنکھیں

مجنون تو ہنسی فوارہ

پھر دھول دھوئیں کا پردہ

آنا حباناً چونکا  
 اک کھیل رتوں کا  
 اپنی نظروں سے اوجھل  
 اک سیارہ دل اپنا  
 اسجانے کھر میں ڈوبا  
 عسریاں پونم کا  
 شفاف رقیق اجالا  
 وہ گھلتے پگھلتے کھنڈر  
 رہ سناٹا اس میں پگھلتا  
 دیکھا تو قلم بھی اپنا  
 اک دن پگھلا پگھلا تھا

شعری شعری شاید اک  
 طائر تھا جو چہکارا

دھند لے دھند لے غاروں میں  
 وہ گھومتے پھرتے رستے  
 آواز کے لہرے کو پھر

باہر لے آئے  
پتے سورج کے نیچے

سورج کے نیچے جھرنا  
ہمہمہ نہ تھمنے والا  
روشن پانی کا

بوجھار کا شور ہوا میں  
اُڑتی ہوئی جگمگ ٹھنڈی  
سیلابی چھلکی چھلکی  
سورج کے نیچے جھرنا  
کروں کے لئے آئینہ

پتھر کے سراپا  
ان کی

پتھر خا موٹی  
اک چکنا چور چھنا کا  
شیشے کا ظرف تھا کوئی

کافر! کافر! سرگوشی

برصم سرگرم ہوا کی  
 کافر! کافر! وہ گچھ  
 پھولوں کے، پھولوں کے خزانے  
 اونچی شاخوں سے جھکائے  
 کس نے؟  
 کیا تنہا تم نے؟

کافر! کافر! سرگوشی  
 باتیں اور کتنی باتیں  
 جاری تھیں کتنے موسم  
 بدے کتنی تقدیریں  
 تحریریں ان کے ابھرنے  
 مٹنے میں اپنا ابھرنا  
 مٹنا

مٹتے مٹتے بھی  
 "ہم" فائق سب سے کہنا  
 کہہ کر کھل اٹھنا  
 اب اک سپنا لگتا ہے

رُت کا بجل پگھلا پگھلا



رت گہرا جل بسر ادا  
 اک خاک بسر آنگن سے  
 اگتا ہوا تارا نغمہ  
 جینے کا جواز ہے کس کا  
 اپنا نہیں پھر بھی کتنا  
 اپنا لگتا ہے  
 اس پر سرد دھنتے دھنتے  
 مٹ جائے یاد نہ آئے  
 پیرایہ مادشما کا  
 یہ کونسی رت ہے  
 کس سے  
 پوچھیں

کیا نام ہے اس کا۔

# لَبْ کُشَا

یہ چپ کتنے دن کی تھی جو آنسوؤں میں ڈھلی  
یہ گہری، چٹان ایسی پتھریلی جامد انوکھی سی چپ  
اس کو چھونا بھی ممکن تھا تب

یہ چپ تھی کہ پورا وجود اپنا جو آنسوؤں میں ڈھلا  
بتاؤ تو اس چپ کی بھیدوں بھری تھاہ میں شور کیا تھا  
بتاؤ تو کیا گونج تھی

ایک صد دوسری سے ہم آہنگ جس میں نہ تھی  
جیسے صدیوں کی بے خواب دھندلی شبیہیں  
دھواں دھار جلتی چتاؤں میں گھر کر تر تختی اچھلتی ہوں  
کہتی ہوں تقدیر برحق ہے، برحق ہے۔ زندہ اٹل  
ہم آہنگ گردش ستاروں کی ہے

پٹر گئیں جو فضاؤں میں لیکیں پرانی  
 وہ ان پر پھرے جا رہے ہیں، پھرے جا رہے  
 سب حدیں ان کی پیمودہ ہیں  
 مگر اپنے خواب و حقائق کا سیل عظیم  
 کوئی لیک اس کی بنادے  
 مگر — کیوں؟

کبھی جو بنادے بھی کوئی تو سوچو  
 ہمارے قدم اور لیکوں کا رشتہ کہاں تک  
 کہ اک حد پر مل جائیں گی وہ  
 تو کیا ہم بھی تھم جائیں گے.....!  
 ہم تو بڑھتے ہی رہتے ہیں  
 چاہے وہ زلزال ہو جو ہم کو نظر آئے  
 چاہے اک سوچ ہو جو تراشے چلی جائے بے شور و شیون  
 سیہ و ہشتوں کے پہاڑ

سزاوار رفتار ہم  
 اور ہر اک گام پر یا سکالی وہ اپنی ہو یا دوسروں کی  
 تاسف میں اور سوگ میں ایک جیسی ہے اپنے لئے

سینہ تھا بھاری تو کیا کیا نہ کچھ پھینک ڈالا  
ہنرہ سے ٹپکتے ہوئے قطرہ اشک کا بار  
خوابوں سے خوشبو کا بوجھ

پنچوڑا تو لہریں بھی ہلکی گلابی ہوئیں  
رہنمائی لے میں گاتی رہیں ، دل دکھاتی رہیں  
کوئی ہم سے پوچھے

کہ اب وقت کیا ہے ؟  
تو ہم کہہ اٹھیں " اک صدا "  
ہم اس میں کھسے کھو گئے  
اب صدا پر بھی تعزیر کیسی

صدا دو —

کہ اک بول کی پیاس اپنے گلوں میں جلائے  
کھڑی ہے ستم کش تمنا کنار فرات

# ارض موعود

وعدے کی زمیں نہیں آئی  
 وہ ادنیٰ شکر جو سب نظروں میں گھرا ہوا ہے  
 بے پروا، معصوم، اٹل

وہ گہرا ساگر جس کی تہاہ میں  
 اپنے سوا کوئی نہیں  
 وعدے کی زمیں نہیں آئی  
 نومیدی پتھر اداے نہ کہیں  
 بے تابی جھلسا دے نہ کہیں

کھو جائے نہ خود ہی کھوج کا گھائی پی بھی  
— اُڑان کے ساتھ اندھیاری گھائی میں

ہم ہیں تو یہی غنیمت ہے

ہم ہیں تو زندہ ہے وعدوں کا اگم  
موجوں کے بعد اُبلتی موجوں کا دھارا  
جو فرا موشی کے ریگستاں میں بہتا ہے  
اس کی راہیں پہلے ہی سے مقرر ہیں  
اور ان سے ہٹ کر کوئی راہ نہیں  
سنگین سچ کی پھرتیلی زمینوں میں  
آرمانوں کا ڈریں کہرا بکھراتا  
سچ کے سوتوں سے پھوٹتا رنگین جھوٹ  
سچ کا ساگر کھوجتا، شیریں جھوٹ  
ایسے نڈر سپینوں کا بہتا گاتا جل  
اس موڑ پہ اپنی منزل سے بھی فزوں ٹر ہے

پھر اپنا دوش ہی کیا

ایفا کے سورج کبھی پگھل جاتے ہیں  
وعدوں کی لالی میں گھل جاتے ہیں  
ہنگام طلوع و غروب سے دُور  
دن بڑھتا ہے نہ رات گذرتی ہے

بہتے ہیں آجبالے شورشِ رسیلے  
 اور مڑماتے دھندلے جیسے بست  
 وعدے اُن گنت کھلا کرتے ہیں پھولوں میں  
 چمکا کرتے ہیں ستاروں میں  
 دھڑکنوں میں سانسوں میں  
 اک سماں سُبھانا چھایا رہتا ہے  
 دھرتی سے آکاش کے بیچ  
 دل سے آنکھوں تک  
 — ازل ابد کی وسعت میں

# رُتِ مالا

نیلے بھورے پر بت تجھ پر  
 برکھا موسم موسم برسی  
 تجھ کو بہا نہیں پائی  
 آنکھیں ٹکرائی پیراڑا نہیں پائی  
 دھوپیں پگھلانے کو بڑھیں  
 تب بدلی چھتر بنی  
 تب شیتل شام آئی  
 نیلے بھورے پریت

ہم تب بھی آزاد تھے  
 اب بھی ہم آزاد رہیں دل شاد رہیں  
 پابندی گر ہو تو ایک ادا ہو  
 اپنی ہی من مانی ادا  
 ہنسی ضدی سدا رہیں



بر باد رہیں تو بر بادی اک بچھی  
ہم صیاد رہیں  
ہم تب بھی آزاد تھے

ہم پاکھنڈی جنم جنم بہتے تھے جیسے تیز ہوا  
جو کچھ اپنی راہ میں آیا ہم نے اس کو ساتھ لیا  
ہم نے سوچا تھم جائیں گے تھام کے تم کو  
تھام کے تم کو اونچی ٹہنی سے توڑیں گے گلاب  
تب تک ہم نے سوچا تیزی روی کا  
ہر ارمان ہو پورا  
تیز روی کی لاج رہے  
ہم پاکھنڈی .....

دھند میں ڈوبے مھینگے جنگل راز بھرے آواز بھرے  
دام بچھلتے ہیں گنجان درختوں کے  
مکتی مکتی !  
منہیں منہیں — یہ نرم ہوا  
اس میں گھلا ملا ہے انساں اور خدا کا دل

نرم ہوا آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے راحت سے  
 اور ستارے نیلمبر کے کتے روشن ہیں  
 ملتی ملتی !

نہیں نہیں — یہ نرم ہوا

دور کہیں تاریک ڈھلانوں میں جادو گرز ہر پکارتے  
 کالی پہاڑی دیگوں میں  
 سیسے کی کانٹوں والی ڈھانچہ ڈھانچہ شبہیں  
 غاروں میں جنبش کرتی  
 ان کے آگے چلتی نیلی پیلی آگ  
 دیکھ کے جس کو ہم دہشت میں پڑے  
 ہم جلتی آنکھیں بھی ہم اڑتی نگاہیں بھی  
 ہم سب سے گہری تھاہ  
 سبھی انقوتوں سے پرے کا افق  
 ہم سب شکھروں سے اونچا شکھر  
 دہشت میں پڑے  
 دور کہیں تاریک ڈھلانوں میں

اور سدا کی

پگھلے پگھلے گلابوں کا جل چھلکاتی  
بسر ادے کی نرمل چوئے شیر سی  
چمکیلی دھارا بہتی ہی رہی  
سُن سُن سُن سب نرک نبجھے  
سب کھا دینے

اور سنہری دھانی نقطوں والی دھرتی ابھری  
پاٹ گئی تاریک ڈھلانوں کو  
سارے نشیب ہیں قد آدم  
اوپنچے بنفشوں میں ڈوبے  
بسر ادے کی نرمل چوئے شیر سی چمکیلی دھارا  
بہتی ہی رہی

اور بہار آئی

وہ شیریں کچا سیٹھارس

جو اس دھانی نازک بیل سے ہم نے پایا  
اپنے خم میں اس کے حوش کو دیکھ کے  
ہم حیرت میں ڈوبے

تازہ گلوں کا شہر دلوں سے لہجوں سے  
 آنکھوں سے چھلکا  
 اور بہار آئی

# بازگشت

نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم  
 ایک بھی ذرہ نہ کچلا جائے اس رفتار سے  
 نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم  
 کنج میں پیڑوں کے سورج جھانکتا تھا  
 کوہساروں سبزہ زاروں میں جھمکتی روشنی کا جشن تھا  
 جشن جاری ہی رہے گا تاابد  
 جاری رہے  
 نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم  
 لعل و مرمر سے گندھا قالب

اور اس کے ماورا اس کے قریب  
 بجلیوں جیسا مصفیٰ اک وجود  
 چار سو بکھرے ہوئے خاموش سوئے آسماں  
 ہم کہاں ہیں ہم کہاں - نغمہ زار درد ہے یہ (ہم کہاں)  
 اتنا بے آواز جیسے  
 آتما اپنی شعاعیں  
 ریشے ریشے سے بدن کے کھینچ لے  
 آہستگی سے بے گزند  
 اور دوری بے فغاں ہو جسم کی اور روح کی  
 کیا سُبک رفتار کر دیتی ہے ہم کو بے دلی بے حاصل  
 جیسے اک بادل کا ٹکڑا  
 اپنی چھاگل پھینک دے اُدنی فضاء میں  
 پیاسے ذروں کی طرف  
 پھر ہلکے پھلکے پنکھ پھیلائے اڑے  
 ہلکورے لے  
 اک مٹی بنتی رنگ کی تحریر سی  
 سیراب زہرے اس کو دیکھیں  
 اور پکارا بھیں  
 وہ کافوری سا شعلہ عظمت نارس !

دوام درد ہے وہ سرخ نرمل روشنی  
(لو سانس کے سرچشمے سوکھے ہر شکایت مٹ گئی)  
کیا شکایت سانس کے سرچشمے سے ان کو رہی  
جو سانس لیے ہیں یہاں؟

موج بے ہنگام خندہ  
کیسے پھوٹی میرے لب سے  
کوئی شکتی ہم میں ہے؟

جو یوں ہمیں پامال پا کر ہنس سکے!  
یہ ہمیں آغاز ہی سے ختم کرنے پر تلی تھی  
چاہے پھر خود ہی مجا در بن سکے انجام کار  
اجتاج اس کا جواک شکتی ہے مجھ میں  
کس قدر پُر شور ہے

کس قدر پُر زور ہے  
نغمہ زار درد سے آگے لئے جاتا ہے تجھ کو

ان فضاؤں میں جہاں  
بارگشت اک گیت بن جاتی ہے اس کی  
جیسے سب ٹیلے چٹانیں اور کہستان  
سانس کے چشمے میں شامل ہیں  
دھڑکتے ذی نفس اور ہم نوا

# شبِ نامہ

یہ ایبرپاروں، ستاروں کا سائبان دھندلا  
 سراغِ رحمتِ کامل یہ اُد ٹگھتا پہرا  
 نظروں ! یہ بتاؤ نظر سے کیا پایا !  
 کرن سی یہ کہ جو کرتی ہے آ رہا ر نفوذ  
 سکوتِ فاصلہ بے کنار توڑے بغیر  
 غلا لورد ہم آ ہنگیوں کا ابھساوا  
 ہنر جو اس کو بنایا ہنر سے کیا پایا



وہی تحیر بے مدعا ، وہی دوری  
 پکارتی ہوئی پیہم قبولیت کی گھڑی  
 جومل گئی بھی تو کچھ مانگنے کا پیرایہ  
 کہاں سے لاتے اسی دن کو دھیان میں رکھ کر  
 ریاض و مشق سے کچھ مانگنے کی عادت کو  
 جو بارہ بارہ برس پختہ کرتے رہتے تھے  
 ہمارے پرکھے ، وہ بھکشو غضب کے دانا تھے

تو پھر چلو کہ نظر اور نظاروں کے مابین  
 حجاب جھٹنے بھی ہیں شان بے نیازی کے  
 انہیں اٹھاتے ہوئے جان کی اماں مانگیں،

تو پھر چلو کہ ابھی وقت ہے ، اندھیدہ ہے  
 نشیمنوں میں شکر خواہیوں کے عالم کو

صدائے گلتے ہوئے دیکھتے دکھاتے چلیں  
ملے درِ دل درد آشنا تو دستک دیں  
وگر نہ فاصلہ رکھ کر سوال دھرائیں

بلند بام سماعت سوال سننے سے  
نہ سیر ہو، نہ پیچے، نہ اشتعال میں آئے  
یہ تاڑ بن، یہ بلندی کا ٹیڑھا میرٹھا ظلم  
یہ جھنڈ جھنڈ تنے اپنی چھتریاں تانے  
خود اپنے اوج زبوں کے خطوط کج رنج پر  
کبھی قبیلہ کے خم، تاسستے حلیفوں نے  
خفیف چھاؤں طلب کی تو بے دریغ ملی  
نصیب غیر نہ کچھ تاسنا نہ کچھ پانا  
ہر ایک گھونٹ جو ہو کر کرا کشیدہ بہ ریگ  
نصیب غیر ہو یا رب، نصیب خویش مزے

نئی نئی کسی افتاد جیسا یہ منظر !

کھپا کے رکھ دے جو نسلوں کے بعد نسلوں کو  
 بہت دنوں سے یہ جاری عجیب صورتِ حال  
 سرشتِ کہنہ کا ، اپنی ہی منتہا تو نہیں  
 سوال اک ان سے جو اُدخیا نہیں ، ضرور کریں  
 جواب بھی بہ اشارتِ رائگاں مانگیں

ہوا کے شور سے بیدار ہو کے دل کی آلاپ  
 ہوا کے شور میں پھر گم سی ناشنیدہ سی  
 چٹانوں تک بھی پہنچتی تو باز گشت کی گونج  
 کبھی تو ملتی — انھیں منقطع وسیلوں میں  
 کوئی ہنکارا ، کوئی عکس منسٹر سیر موج  
 کسی جھی موڑ پہ در ماندہ کھوج کی غماطہ  
 گر پڑا کوئی موتی شکستہ مالا کا ،  
 ملے ملے نہ ملے پھر بھی ڈھونڈنا ہے ضرور

اکیسے پن کی بکھرتی ہوئی نمود جسے

درد مند دل کی لویں

جھگمگاتے نور نور

شناگری نگاہِ نغمہ در پہ

یہ قسرض تھی سو قسرض ہی رہی

وہ بھلا بھلا بھری کی اک اداس ہی

کہ جھک گئی جس میں

فراسی بات تھی جسے بڑھا دیا ہمارے پیار نے

ہزار ہا دلوں پہ ایک کیفیت سی

جیسے موسم کے مجسموں میں ہر برق کی

گذر گئی

علم جھکا؟

نہیں نہیں

کہ آفتاب جلسہ گاہِ حشر و نشر کے قریب پھٹ پڑا

نہیں نہیں

گمان بد

نشان بد اتھاہ پیار کا

اٹوٹ قول کا قرار کا نشان بد

گمان بد ، گمان بد سے مادر

گہر بہ چشم عفو کار و لنوازِ نغمہ مشی

نواحِ حبا معہ !

چراغِ درگزر، بجھا ہوا وہ

پھر جلا — کہ شام ہو چکی

.....



# شفیع الامم

مرے دل میں کیا ہے  
 وہاں سروسامان چٹانیں کھڑی ہیں ابھی تک  
 جگر تاب دو پہر میں  
 وہاں آئینہ ان کے شایانِ شاں ہے تو سورج  
 وہ شاہد ہے اُن کا  
 دی جان تلہ مرے دل میں کیا ہے

وہاں ان چٹانوں کا سایہ بھی باقی نہیں ہے

جہاں وہ چٹانیں کھڑی ہیں ابھی تک  
 بیو لے وہ پس ماندہ اُن کے عزائم ہیں شاید  
 جو یوں چاہتے تھے

کہ گڑھ بن سکیں  
 پشت ہا پشت کی زخم خوردہ آنا کا

ہر اک ضرب جس نے بچوڑی ہے آہن دلوں سے کراہ  
 مری روح کے شور و شیون میں پتھر اگئی  
 جھپٹتی رہی اپنے خوں ریز جتھوں کے ساتھ  
 قضا مضمحل قافلوں پر سدا

وہ بن ماں کے ہر نوٹے جب بھی گھرے  
 ان سیہ نام غزاہٹوں میں  
 تو پھر خوں چکاں مرگ آ شام اک کھیل  
 تا دیر جاری رہا  
 نہ پتھر ملے کھڈ میں اتر کر لرزنا

نہ چھینا دیکنا گھنی جھاڑیوں میں کوئی کام آیا

وہ شاہی کا زریں بگولا  
جو پھرتا رہا بحر و بر خشک و تر کے پر خچے اڑاتا  
اسی کے تو زرتاب زرے ہو تم  
تم نے سوچا یہ اکثر

مگر تم نے سوچا نہیں  
تب بھی تم صرف پیادے تھے  
تب بھی

کوئی اور تھے شاہزادے

غریبی میں پالا تمہیں ماؤں نے  
پھر زمانے کی گردش ہوئی تم پہ جاری  
رگوں میں لہو بن کے جو دوڑتی تھی  
وہ بس دودھ کی لاج تھی  
اور نادار پرکھوں کی پونجی دیانت  
رگوں میں لہو بن کے جو دوڑتی تھی  
اسی سے تو پارس بنی دھول رن کی سدا



خاک میں اٹ کے کندن ساچم کا سراپا

بلوٹوں کا بن

زو میں وزنی کلہاڑوں کی آتار ہا بار ہا  
 اور تنے جیسے افتادہ مینار آہن  
 پڑے تھے ہر اک ذمہ داری سے بے فکر  
 کتے دنوں تک انہیں اُن کی جا سے  
 ہلانے نہ پایا کوئی  
 وہیں دُور و نزدیک نہٹتے بلوٹوں نے سیکھا بھجکنا  
 بلند ی کے انجام کو دیکھ کر بھی  
 بلند ی کی جانب لپکنا

نہ زیاں میں کوئی مدا  
 نہ آنکھوں میں گھلتی ہوئی نیند  
 پیرایۂ رحمت رب

اب اس دُور اُفتادہ رقبے میں  
نیل ہٹس آسماں کی

جو واحد شناسا ہیں

گو ننگے دلا سے کوا اپنے زباں بخش بھی دیں  
تو کیا کہہ سکیں گی

وہاں ایک زنبور نے باڑھ کے پار منڈلا کے دیکھا  
تو رس اس نے کچھ بھی نہ پایا  
اس نے مجھے لوٹ کر یہ بتایا

وہ اپنی ہی مانند ہیں ہو ہو

فرق بس ہے تو اتنا

کہ تھے جو بہت خبر و

منکر آئینہ بن چکے

کبھی یوں بھی تھا جب  
ذرا جھک کے کچے گھروں سے نکلتے تھے باہر

وہ ہنس مکھ سویرے وہ شاداب نصف النہار  
تو سرسبز گڈنڈیاں دھوپ میں ڈوب جائیں

ادھر طرے ہوئے پیرہن سے  
جھلکتے ہیں تانبے کے شانے  
تو ان کی دکھن چرخ چرخ اٹھتی ہے  
”یادداشت !“

صلیبوں میں اے سب سے بھاری صلیب !  
کہیں اس سے بہتر یہ ہوتا  
کہ خم شدہ رگوں کے وہیں کھول دیتے  
اگر دقت نوروز بنتا ہمارے لئے  
تو اقوام عالم کی ہوتی یہ باری  
کہ ڈھونڈیں سدا کو عذاب حیات

اگر جنس بازار ہو تیں مرادیں

تو جاں کے عوض مول لیتے  
 مگر کب شکستِ عزائم سے ہوتی  
 چکا چوند عرفانِ حق کی  
 جو صد سالہ شبِ زندہ داری سے ممکن نہیں  
 بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں آنکھیں  
 بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں  
 دارا تھیں گہرا تھیں آنکھیں  
 سکوں کی گھنی چھاؤں تھیں دردِ مندی کا دریا تھیں  
 صدق و صفا کا ذخیرہ تھیں آنکھیں  
 مگر یہ پہاڑی کے دامن میں پھٹے ریلے کُنڈ  
 نہ جانیں اُبلنا، مچلنا نہ شورش میں ڈھلنا  
 تحمل کی شاموں میں گہرائیاں  
 اور گہری ہدوئیں اور گہری  
 کبھی ہلکی ہلکی گلابی سنہری  
 کبھی ارغوانی الاؤ  
 چکا چوند عرفانِ حق کی

”یہ سچ ہے کہ پچھلے برس میں نے

تو نہ پیدا ہوا تھا  
یہ سچ ہے کہ اس سطح برتر سے  
جس پر ہوں میں ایستادہ

نشیبی کناروں کی جانب رہا ہے بہاؤ  
مگر یہ ترے کیف و کم سے فزوں تر  
مرا کیف و کم

اسے بھی جو جھٹلا سکے اب تو جھٹلا  
اچانک نشیبی کناروں کی سمت ایک جہت سیاہ  
کچلیوں میں دبے نر خرے سے اُبلتی ہوئی سُرخ آہ  
اور پھر کچھ چبائے ہوئے استخوان  
آخری یا دگار

سدا بھیڑیے نے اسی ہلچہ میں بات کی  
یہاں تک کہ اک دن نشیبی کناروں کی حد میں وہ آیا  
تو حیرت سے دیکھا کہ ننھا سا اک میمنہ  
کا پنتا تھر تھرا تا وہ ہے خود بدولت  
کبھی میمنے کو بھی قسمت نے اک سطح برتر نے  
خنجر صفت ناخنوں سے نوازا

بدلتے ہوئے موقوفوں کا سیر روز پہ پہ  
رہا گھومتا کورو کر بے ضمیمہ

بلبلِ نرینا و فضل و برتاؤ پیر  
 ہجوموں کو روندے گیا  
 اٹھی، مرحمت روئے ایک اشکوں سے بوجھل گھٹا  
 اور لاوا اگلتی زمینوں پہ اک دم بخود سائباں بن گئی  
 سکوت اس کا بادیدہ نم پکارے  
 نہیں عدل عدل !

ہزاروں دلوں میں دبی ہوک  
 زلزال کا روپ دھائیے  
 ہزاروں بڑیدہ زبانوں کی کیفیت بے زبانی  
 کیئے جائے پیہم اشارے " نہیں عدل عدل !

اُجالا ہزار آنکھوں والا  
 گراں باراجرام کی باگ تھلے  
 دلِ ذرہ بے فدا کا جرات شناس

اک تحکم تأسف سے عاری  
 فنا کار پاداش گیر  
 ایک فرماں، اٹل، ہستی و نیستی کی اساس  
 اک منادی ندا جس کی ہے القصاص القصاص

پھر پہل سنگ باری کی کرنے  
 بڑھے کون پاک آستیں سب سے آگے؟  
 خموشی —؟

خموشی نہیں —! چشم پوشی یہ بازی نہ ہارے!  
 مشینوں کے بد مقابل مشینیں —  
 درندے جراثیم عفريت — حشرات کی نسل نو

یافنا یا عدم ہم —؟  
 کہ پھر ہم ہیں وہ جو من و تو سے ہٹ کر ہے

دارائے ہمت  
 ہمیں ہیں ہماری نمود و گمراہی تاریخ روشن ہوئی  
 ہمیں ہیں ہماری نئی آفرینش

کوئی دوست اس کا نہ بھائی پتہ ، نہ شاگرد و استاد  
موج در موج دریا رانی سے آباد

میں نے کہا کون ہو گا وہ دامِ علائق سے آزاد  
دل نے کہا ، شہری شہر اسکاں  
وہ ناوک فگن

تیز جس کی کماں کا ہیلڈا  
کبھی مانگ بیٹھے جو خونِ جگر اس کا اپنا  
تو وہ سمت جو اس کی ہستی ہے  
اس کا نشانہ ہو

اس کا ہدف لعلِ ناب —

اسی سمت کا خون روشن  
ہم آہنگ آئینِ گلشن  
اسی سمت کا خون روشن نگارندہ روزگار  
رن آہنگ کے پہلے سویرے کی لالی

اسی سمت سے آشکار  
اسی سمت کو کھوکھے دھارے نے رفتار کھودی  
تجھی سے پراگندہ قطروں کو

پامال سبزے پہ  
شبِ نیمِ نصیبی ملی



یہ بھو بھل میں ڈوبے ہوئے شہر، قریے  
 کبھی ان پہ رم جھم نہ برسی ہماری پکار  
 کبھی ایک انگشتی ایسی ہوتی  
 نیگیں اس میں ایسا  
 کہ تاج ہو جس کے کوئی جن

کہانی کے الفاظ جیسا  
 تو پھر اس پر نے جو الا مکھی کے احاطے میں آباد  
 پیارے مقاموں کو شہر لگاتے  
 قریہ سمندر میں

بہتے جزیرے بساتے  
 گھڑی ڈوبنے کی جو آتی  
 خوشی سے قریہ سمندر میں ہم ڈوب جاتے

پھر وہ پھنکار اٹھی  
 دور میلوں مسافت پہ اہراتی ناگن سیاہ

آج مدت کی پتھر خموشی بھی بن کے پانی  
تو یہ فیض ہے کس کی گردِ قدم کا  
”تمہیں میں کچھ ایسے بھی ہوں گے“

کہ جو پایہ زنجیر  
لیجائے جائیں گے سوئے بہشت“

کسی بھی بہانے

دوبارہ نظارہ

انہیں بھولی بسری فضاؤں کے

کچھ جانے پہچانے مانوس عکس

دیر تک کا پنہ آنکھوں کے خونناہوں میں

یہ اُن ہونی ممکن ہوئی بھی

تو اس ذوفنونی کے ساتھ

پیش قدمی کے خطوں سے

لپٹائی کے منطقوں سے بہت دور

بکھرا ہوا ہے کئی صدیوں کا ساز و سامان —

درشہ رودِ محکونی و شاطری

کتنا بے اشک رونا

بھارا تمہارا سبھی کا —

ایک جگہ خوارِ تھار — غدارِ غدار —

دوش و فردا فراموش کاری کے اوراق خمستہ میں لپیٹے ہوئے  
لحٰن و اصوات

صحرا کی راہوں میں بے اوٹ شمعیں سحر دم  
بھٹکتی ہوئی راکھ پروانوں کی دُور دُور

اور اُص پار —

کتنے کہستاں درے وادیاں ریگ زار  
اپنے دامن کے پالے شگوفوں کو

بے اُنت بن باس پر بھیج کر

دھندلی آنکھوں سے تکتے سوئے رہ گزار

شورِ ناقوسِ خوں و رنگلو

اور ندیوں کے تپ ایک گم گم پکار

ہزاروں برس درشنوں کا سویرا

ہزاروں برس کی شبِ انتظار !

گجر دم کے گارھے کھر میں سُرینگیں بناتی ہوئی

پہنچ انجن کی بڑھتی گئی

نیم خوابیدہ آنکھوں پہ ٹھنڈے چھپا کے لگاتی رہی

میخ ہوا

جھرجھری ایک تن من میں جاگی  
تو شعلوں میں لپٹا تصور کا کج نوا

پھر دوبارہ اُچھرنے لگا  
شبِ نمستادہ ڈوبا ہوا دھند میں  
راکھ خواب پریشاں کی اس پر بکھرنے نہ پائی تھی  
سبزے پہ اس کے اُترنے پایا تھا فردا کا سایہ سیاہ  
دُور تیزی سے پیچھے سرکتے ہوئے  
کھیت میدان جنگلی

امدھیرے کے بھاری لحافوں سے نکلے  
مُوزن کی آواز پوری طرح جاگ اُٹھی  
پہلے بجلی کے کھمبوں پہ روشن ہوئی فجر  
تاروں پہ بیٹھے ہوئے طائفروں کے

پروں میں چھپی رنگ رکھا عیس  
بھلکار اُٹھیں

اک ندی پل کے نیچے جو چمکی  
تو نام اس کا کیا تھا؟

شرابوری جانِ دل !  
کچھ شکستہ سے مینار

کچھ پُرانی سی اک عید گاہ

وہیں ایک لڑکی اُبھرائی نادان و حیراں

اُٹھائے ہوئے جل بھری ایک گاگر

ہو اُسے بیا بیاں کے ریلے میں تلوؤں سے تھامے زمیں

سنبھالے وہ اڑتا دوپٹہ اب اپنا

کہ ہراتے بالوں کو باندھے غریب

اکیلی ہے جیسے علامت

اسے میں نے آواز دی :

استقامت !

تجھی اک مادھورا کمرِ نرم تاب

مکمل نمودارِ خطِ افق سے ہوا

اک گھنے گنج نے اس کو دل میں اتارا

تو جگ مگ کا چشمہ ہوا دل سے بھاری

شبِ رفتہ کی تیز آندھی میں بکھرے

نشین کے تنکے

اُٹھاتی رہیں تن بہ تقدیرِ معصوم چہڑیاں

پیروں میں سمائی ہوئی برق

پیروں میں پارہ

اسی کھپلی ٹہنی کے اطراف

بجتا رہا شور کا جھل ترنگ

ہوئی تیز جب وعدہ کی گر طگڑا ہٹ

تو کانے لگے شکر

وہ زمزمہ سنج رنگیں پتنگے

کہ آخر گلی کو چوں کے گندے بلووں سے ہو کر

یہاں تک تو آیا ہے وقت

کہ ٹکرائے چقماق چقماق سے

اور طغیانِ خوں کے عوض

چاکِ دل سے اُبل جائے

یورپ کا آہنگ

شاید کبھی

جو مدِّ مقابل ہیں شانہ بہ شانہ کھڑے تھے کبھی

میرے آپنچل کے سایے میں ان کے لئے

بھول خوشیوں کے ہکے  
تو میں کتنی اونچی اٹھی

بھائی میرے —

سمندر کی تہ کے سیہ پانیوں میں دلی  
اک صدا کا حباب

ٹوٹ کر مٹ گیا سطح پر شور پر  
دھونکنی نشر گاہوں کی دھونکنے چلی جا رہی ہے  
خبر پر خبر

سنسنی تہلکہ دھوم دھام  
دل میں اک گد گدی سی — شامت  
زباں تک پہنچ کر رہی  
ایسی بیڑے کی گھن گرج بن گئی

یہ دنیا ! یہ دنیا !

اسے تم نہ سمجھے

نہ سمجھو گے آتش بجالو !

گھنے ابروؤں میں چھپی برق

پیہم جھپکتی ہے

بے سمت بے جہت تکئی ہے دیوانہ وار

دیو ہیکل مشینیں فضاءِ دل پر مارتی

خاک پر رینگتی، مریح پوچ

آج نوا دیکھلا

بھڑکتے رہے سُرخ بھٹی میں

ارماں اسرار جوش جنوں

مامتا دودھ خوں

جانکنی کا ادھورا نشہ جب بھی ٹوٹا

تو پیسے گیا ہوش و احساس کو بے دریغ

دور بکھرے دھوئیں کو نکلتے ہوئے

کھر دُرے اور غم آلود پتھر کا لمس

جذب ہوتا رہا جسم و جاں میں — 'نہیں'!

— 'نہیں' قلب چھینا

زباں، 'ہاں' کا انگارہ بن کر

جہاں جل بجھتی

— 'نہیں'! — اور اقصائے کون و مکاں

خون سے بھر گئے



# اُفتاد گاہیں نجوم کی

گرتا ہے اندھیرا  
 دھنواں اگلتی رفتاروں کے بعد  
 وہیں تاروں کے قریں  
 منظر بھی کرچ کرچ بکھرے  
 نظریں بھی کرچ کرچ بکھریں  
 یوں اپنے آنگن میں اتری  
 وہ ماہ منی کی جھل  
 اپنی کھیتی میں اچھی  
 دہر کی من مانی

ہم ایسے بے روپ  
 کہ پھر جو روپ ملا وہ اوڑھ لیا  
 شام امروز شب رفتہ

صبح فردا  
پہناوا بنفشوں کا  
اترن بن کراترا ہوا

پارہ پارہ مٹ مٹ  
کس چاؤ سے خود کو پہنایا  
اک فصل کے بعد کی فصل  
پیرانا کھار کا ڈھیر  
ہم کھپ گئے جس میں تھایہ وہی جینا

دن الحمرار ایسے ترشے ترشائے مستحکم  
سایوں میں پھیلے آہوں میں پگھلے  
اب پھیلے قالب کی چاہت میں جان کھپانا  
ہو جتنی تعمیم اتنا شرانا کہا  
پی لیتے ہیں تعمیم کو گہرے گہرے خلا  
پھر ان کو پاٹ نہیں سکتا کوئی بھی کبھی  
تعمیم کو جس چھلنی سے چھانو  
موبہونی چھنتی ہے سدا

بھٹکے بے چہرہ بے کفِ پایا  
 جیسے سرگرداں معتزلہ  
 پُرجوش فطانت سایہ و سبزہ و آب سے عاری پگڈنڈی  
 کھائی میں مٹری اور ڈوب گئی  
 پھر جان نہ پایا کوئی اس پر کیا بیعتی

لو سانس بھی آہستہ  
 یہ شیشہ گری کی کارگاہ نازک افتاد  
 ہو جائے نہ درہم بہرہم  
 ہم ڈرتے تھے  
 اپنے قدموں کی جلنش سے سہل انگار  
 اک ذرہ بھی پامال ہو ہو  
 تو نہ جانے کس کا ہو آبلے  
 گردشِ فانوس خیال کی تین ذرا  
 معمول سے بڑھ کر ہوتی  
 اور مہکٹو میلہ میں وہیں چمچ جاتی تھی  
 سب رنگ دھنک کے گڈٹ  
 دھنکے ہوئے اڑتے پھرتے  
 ایسے میں اکثر چھوٹ گیا

دامن اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سراپا کا  
 تب ان کا تختہ الٹ دیا  
 اس دہرنے جو بن کر جام ایام  
 گردش کرتا آیا ہے انانوں میں

سب تیر ہر ہل شجر حجر ذرے اجرام  
 سب جزو کل ہیں مگن  
 اور اک اہم  
 ایک انیک کا گمستارہ  
 اس گردش و نواح میں کون آئے گا دوبارہ  
 سب اڑتی اڑتی اوپری باتیں  
 اپنی اینٹوں پر اینٹیں  
 گارے پر گارا رکھتی جائیں  
 سمیر غ تھکے ہارے  
 کہتے ہیں کوچ

قہقروں بھرا پھیلاؤ گھنا  
 اک شہر فکیل کے پار ملا

اک ٹھوس اکائی اپنی اٹوٹ  
 تانبے کے تاروں سے جڑی  
 یہ ایک مشین ہے وحدت پرزروں کی  
 جب تک چاق و چوبند ہیں چلتے ہیں  
 ورنہ سچھٹی

ہم سربہ نلک تعمیروں کے معمار  
 پسٹے ہوئے بے میعاد انھیں کے بوجھ تلے

تب ایک  
 انھیں کمزوروں میں سے  
 جو برداشت کی حد سے آگے بڑھ کر  
 بوجھ اٹھاتے نہیں  
 اک چنچ بنا  
 جاٹکرایا

اس ہاتھ سے جو ہتھے پر تھا  
 خود کار کسی جینش کا وہ ہاتھ  
 مامور تھا تیزی سے حرکت میں آ جانے کے لئے  
 ایسے قدموں کے خلاف  
 جو چلتے چاک کے ساتھ نہ چل پائیں  
 تب آنا فانا وہی قدم لغزش کا شکار  
 زمیں سے اکھڑا

قربوں کا  
 زمانہ طے کرتا  
 تب جا کے کہیں  
 پہچان کے جھرنے کی شورش  
 سنگستاں جاں کی تہہ میں

انسان بھی سن سکتے  
 بے گنتی آنکھوں میں  
 تب پیڑھی پیڑھی  
 برکھارت کی بستی بس جاتی

چاہے دیر سویر ہو  
 اور کڑے کوسوں کی دھوپ

ہم نفس واحد

آخر کار

آہنگ اک موج کا

سب موجوں کی دھڑکن میں بس جاتا ہے

پھر اُن ہونی کی خسار آلود آنکھوں نے کیسے خواب بنے

اک طالع روشن

آفاق اعلیٰ پر چمک اٹھا

کیا یہ بھی سفرِ مبارک ہوگا مطلع ہوگا

ان آنے والے سویروں کا

جو زیرِ نمو ہیں ابھی

آوازِ قلم کے چلنے کی

دیتی ہے دہائی 'ادب ! ادب' !

یہ راہِ سفر

ہو پائی نہیں طئے

چالِ سمے کی چلتے ہوئے

گذری یہ شعبِ ابی طالب سے

طائف کے

سنگِ افشاں باغیچوں کی طرف

جب لہو لہان تھا دقتِ ایسے عالم میں بھی

آنکھوں میں بسا تھا وہی روشن چہرہ

جگمگا رہے جس کے پیر تو سے ہیں غرب و شرق

کتنے دن بعد

ہبوطِ آدم سے

کتنے دن بعد

سہمی تھی وہ رات  
 بے ریب بدیہی سچ کی نشانیاں  
 روشن جس میں  
 اک ذات سراپا چاہت آدم قدس گرم سفر  
 منزل بھی اس کی ذات بے ہمتا  
 وہ تاب نظر معصوم نیاز آگیتیں  
 ہنگام قرب  
 سرمست قیام ، قدم انسانی لافانی  
 جب سے اک فصل ادب کے ساتھ وہاں  
 تب سے ہی یہ ورد انا کی  
 بے میعاد دکھن  
 اک فصل شہادت کی میعاد بنی  
 اقصیٰ تا سرحد شارع عام ،  
 رواں روشن آباد بنی  
 تب سے ہر باز اشہب نے  
 پایا اپنے شہپر کا جواز



# بہتاپانی

اجلے اجلے تناور تنوں پر تھمے نخل زار  
 منشتران میں سیاب گوں نو دمیدہ ہلال اُن گنت  
 بیکرانی کے شفاف زینوں پہ وہ  
 فاصلوں کا بھسم بستیاں دور دور  
 آب گوں اک دھندلکے میں لپٹی فضاء خواب گوں  
 اور نظر کی پہنچ پست و بالا میں بے روک  
 میں نے کہا

کن کے ناموں سے منسوب ہوں گے

یہ تکتے قدیم

شائبہ سا اک احساس رفتار کا

اپنے ہونے نہ ہونے کا بے سود دھیان

اچانک کہیں اک درندے کا بیٹن

وحشت آلود — بد مزہ بوالہذا کی  
تیز جھونکا سا پھرتا اڑان

جھاڑ جھنکاڑ کے درمیاں  
پر بچاتا سمٹا گزرتا ہوا  
اک تعاقب کی دہشت  
کہ ختم جا

کہیں اوڑھ لے اپنا روپ  
ایک ضرب مسلسل  
نمودار ہو جا

مگر ہے کہاں جو  
نمودار ہو اب

کہ ہم اس سے عادی ہوئے  
یہ بھلاوا

پنہ گاہ اخفار کا کوٹاہ دامن گرٹھا

کتنا پایاب تھا

جب وہ مٹی نم آلود اب تک  
وہ افتاد گاہ

علم دار کی

میں نے پہچان لی  
کیسے پہچان لی

# فجر کا آلاؤ

نگاہ سے نہاں آلاپتے ہوئے  
ہزار ہا پرند  
آلاپ ان کی کوٹھتی ہے ٹور کے ورق  
سُرور کے ورق

آلاپ ان کی پوچھتی ہوئی  
کہ وہ آلاپ

جو بدلتے موسم کو پیرا ہن عطا کرے

کہاں ہے ؟

نیںد بند کھڑکیوں کے رُوز نوں سے جھاٹکتی ہے :  
— وہ یہاں نہیں

یہاں نہیں کہ آج اور کل کے درمیاں کافِ صلہ  
شمار اس کا

اپنے صرف کردہ ایندھنوں میں بھ چکا

وہ نادہند  
اور نادہند سے تقاضہ کیا۔

چٹخ چٹخ کے دُور تک  
اُچھل رہا ہے  
جل رہا ہے فخر کا لاؤ  
دُور دُور تک  
کہاں ہے پگھل رہا

گپھا گپھا نیگوں کے دائرے  
گپھا گپھا نیگوں کے دائروں میں  
بن گھنے کہ جن میں جھپٹنا  
پیسویوں کے ساتھ ساتھ تھا عہدِ مُقیم  
جل رہے ہیں  
جل رہا ہے فخر کا لاؤ  
سُکندھ اس کی اتنی گھائل اتنی تیز ہے  
کہ سیلی سیلی یہ سُکندھ ہے لہو لہو۔

سڑک کے کنکروں پہ  
چاک گھومتے ہوئے  
اداس سمنوں کے

جاپ سے نہ رکا کے  
دراڑ پڑ گئی تو پھیلتی چلی گئی۔  
ادھر کسی کو وقت کا پہاڑ کاٹنا  
ادھر کسی کو

جنش مرثہ سے  
گاؤں گاؤں بھرے مرقدوں کے بیچ  
فاصلہ تھا پاٹنا

چراغ چشم نم  
کسی بھی شام کے نواح میں جلے  
کسی بھی یاد کے  
شکستہ طاق میں بھڑک اٹھے  
سدا وہ زیرِ خاک

راہ ڈھونڈتا ہوا چلے  
مگر سراغ اس کو بل کے تو صرف اس قدر

کہ دُور  
جان و تن کے مَادِ مَن کے فاصلوں سے دُور  
سطحِ بحر پر  
گہرا اُچھالتا ہے صُبْحِ شاہوار۔

یہ قہر جو ہمارے درمیاں روا رکھا گیا  
یہ قہر۔

کس غضب کا ناگزیر

یہ فصل  
جس کے بعد قُربِ دل پذیر  
اسی کی آڑ سے تو رونما ہوا  
جواز خندہ ہائے بے بہا کسی کے واسطے

کسی کا بھولپن

کہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی

وہ میرا اپنا بھولپن ہے

ادھر وہ نور نور تجھے

دُعائے مستجاب کے

ادھر وہ نیند

اُس کی باڑیاں گھنی

چمکتی اس سے بھری پٹری  
 دبیر دھند اس کی  
 شش جہت سے گر رہی ہے

بہ صواب و ناصواب  
 منظر کشادہ باب — نیند  
 میری اپنی نیند  
 کروٹیں بدل رہی ہے  
 چشمہ ازل ابل رہا ہے  
 جل رہا ہے فجر کا لاؤ

!!!

# نرملیٹ پانی کی تلاش

وہ مراد ہم  
 کہ جھونکا سا کوئی سبر قبا تھا  
 جسے دیکھا  
 کسی چہکار کی خُشکی بھی فضا میں جو کھرتی  
 تو یہ کھلتا

کہ ابھی کھونج ہے آغاز ابھی کھونج ہے پرواز  
 کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہو کھونج یہی  
 راکھ کی مٹھی میں دبی ادھ جلی پتی

وہی معمول شب و روز  
 کہ بیدار ہی بیدار ہے



رنداجو لگاتار رہے پھیرتا اپنا

تو بہ ہر زاویہ ہموار

بہ ہر زاویہ چھل چھل کے گوارا

کہیں ہو جائے نہ بے ساختہ فریاد

یہ دھڑکا سا بنا رہتا ہے دل میں !

وہ تنے ٹوٹ رہے ہیں

جو قدم تھے جو بھرم تھے

کہ کوئی لفظ نہ پایا نہ کسی لفظ کا مفہوم

جو پانی کا بدل ہو

وہ تنے چھان کے خاموش تہیں خاک کی

خاموش تہیں آنسو سے افلاک کی

لوٹ آئے وہیں

اپنی سسکتی ہوئی پیودہ حدوں میں

یہی آثار فضائل کے کھلم پن سے مزاحم

جو گذرگاہ میں سیلاب کی ہوتے

تو کسی موڑ پہ مڑتے ہوئے

شبنم کا نم و نرم بچھونا انھیں ملتا

تو دو صد ریشہ عناصر وہ گلے بیچ  
 ذرا دیر کو ہو جاتے وہیں ڈھیر مڑے میں  
 کف سیلاب میں الجھے ہوئے خاشاک میں پوشیدہ  
 وہ جُڑ جُڑ کے بہم  
 چلین سے سوتے

کہ ابھی دیر سے اعلان سحر ہوتے ہیں  
 اعلان سحر پہلے سے جو بھی سحر خیز  
 وہ اوروں کو بھی جاگ اٹھنے کا  
 پیمان فراموش شدہ

یاد دلائے  
 یہی کلیوں کے تبسم میں گھسی یاد دہانی  
 جو ٹھٹھڑ جائے سماعت  
 تو سماعت کے لئے ایک انوکھا سادھما کہ  
 یہ مراد ہم مشکونی مری زنجیر  
 کوئی اندھکار اُتر آئے جو پایاب گمانوں میں  
 تو پایاب گمانوں میں  
 اُتر آتی ہے گہرائی یقین سی  
 کوئی سیاح سے سیار سی جھلکار اُتر آئے  
 جو ٹھہرے ہوئے پانی میں  
 تو ٹھہرے ہوئے پانی میں

روانی کی مشاہدہ  
مری آشفستہ نگاہی

وہ کہاں پھر بھی مگر لہر تلے لہر کی تعمیر  
کہ دے جس پہ جگر تشنہ تمنا بھی گواہی  
وہ جو اک سطح گراں مایہ ہے  
اک قصر بلا خمیر

آبھرتا ہوا ملات  
اُترتا ہوا غواص  
جہاں وہم نہیں  
زندہ دتا بندہ حقیقت ہے دل آویز

کوئی پیرے کی کنی سی کہ ہے طینت میں سرشت  
کبھی آواز کی لوہن گئی  
آفاق بہ آفاق پلٹتی ہوئی اوراق  
کبھی چھنتی رہی آنکھوں سے پیہم صفت اشک  
تو بدلتا ہوا رستہ  
تہہ دریا ہے دہکتی ہوئی بالو میں

نکلتا ہوا راستہ  
جیسے دیکھا

وہ مراد ہم نہیں میرا یقین تھا  
کوئی بوٹا جو کھڑا ہے  
تو یہی کام ہے اس کا  
کہ خزانے کا پتہ پوچھنے والوں کو بتائے  
جو خلاؤں کا عقب ہے  
وہ خلا کب ہے خلا کب

جو وہاں بھی  
اسی کملی کا کنارہ ہو  
کسی دور کے امکاں سا جھلکتا  
تو وہاں بھی وہی پھیلاؤ جھلکتا ہے چمکتا ہے  
سحر رنگ دھندلکے میں  
سیہ چشم تجلی کا خنک تاب تلازم

تو جگر سو خستگان دو جہاں  
کون ہے پھر کھوج میں سرگرم ؟  
یہ تم ؟

گھیر کے لاتے گئے تم ؟  
 یا وہ نظر منزلت آرا ، نظر صاحب کوثر ہے  
 کہ ہے گشت میں بیدار ؟

جسے دیکھا

وہ اشارہ اساکہ ہاں جو ف عدم  
 جو ف عدم میں بھی جو ممکن ہے  
 خود آرائی کے عالم میں یہ فیضان کا عالم  
 تو یہ حیرت کا ٹھکانہ نہیں  
 ٹوٹے ہوئے آئینو  
 یہ جڑ جبانے کی منزل  
 یہ جلا پالنے کی جا ہے

# جادو رسائی

(منہج البلاغہ)

بڑھتے ہی رہو  
گو بنی سناٹا  
جادو کا لکھ چٹخ رہی ہے شر و شر

پیچھے مڑنا پھٹنا جانا  
اس راہ کا ہر پتھر  
رہا گیر تھا اپنی ہی مانند  
اک دورِ گزشتہ میں  
پیچھے نہ مڑو

بڑھتے ہی رہو جیسے بڑھتا ہے کیلا سخت ثمر  
 بڑھتے بڑھتے اکتاتا نہیں تھک جاتا نہیں  
 بڑھتے بڑھتے پالیتا ہے اک دن رُت کا  
 شیریں مدھ ماتا کیف — کھلا  
 وہ دروازہ

جواب تک نامعلوم رہا

اندھکار کی تھاہ میں اک پورب  
 پلتا ہوا جب  
 شاخوں پر رہینگے کیڑے کے  
 ارمان سے پھوٹ پڑا  
 تسلی کے پنکھ کھلے دھیرے دھیرے  
 اُجلی چمکیلی خوش رنگی  
 لحی کے قالب سے جھمکی  
 پھر لا محدود سویرے سے وہ ہم آہنگ ارمان اُس کی

د امان صبا کمرنوں کی بسرا  
 تھامے ، ان اُنقوں تک جن کے

آگے درکار نہیں رہتا  
 دامن صبا کونوں کا سرا  
 کوئی بھی وسیلہ بڑھنے کا  
 بڑھتے ہی رہو

صد ہا وہ سہی وہ ہزار سہی  
 کوفہ کی چٹائیں گنتی ان کی لا حاصل  
 تب اپنا سایہ اپنا ہم رفتار سہی  
 چلتے چلتے ان راہوں پر  
 وہ روپ سجدہ لافانی  
 اقلیم غبار کے پار ہوا

جب دن ڈھلنے پر جانِ پدر !  
 ہنگامہ بیت چلے  
 ہوں فولادی شمع روند رہے  
 بکھرا ہوا رختِ سفر  
 بازو شہرِ مشکیزہ علم



چقماق کے پتھر تیر کمان کتابِ قلم

باری آئے نیروں کی اینوں پر

بڑھنے کی

در بستہ ہر سمت مگر

جنگاہِ شام کی سمت کشادہ رہے

آباد یہ حبادہ رہے



# سلامت کی بوجہ ترا ساقیا

ازل بھولا بسا اک خواب ہی  
سہی

بند اک باب ہی وہ سدا کے لئے  
مگر بار بار

حرف حق لوحِ جاں سے مٹایا گیا جب  
بہ انواعِ جبر

ازل ہی وہ مصرعہ اٹھانا اب تک جسے ناگزیر

دھماکے سے پہلے کی اک سنسنی  
بنی امتحانِ گاہ میں

خوفِ دہشت کے ہمدوش اک ذمہ داری کا بار

یہاں ہم نہ ہوتے جو امیدوار  
 تو ہوتے کوئی اور اپنے ہی وہ ہم نشین  
 زمیں آسماں فخر سے، اور غبارِ پس و پیش ہم  
 دیکھتے ان کو کس رشک سے  
 سوالات پیچاک سے ارتقار کے جڑ سے بے شمار  
 وہ حل کر رہے ہیں  
 فطانت میں شامل دیانت کے ساتھ

ستاروں کی تقویم کو کس نے دیکھا ہے  
 لذت کش انتظار  
 جریدہ میں ثبت اپنے نام  
 جہاں دیکھ پائیں گے  
 سطح وجود  
 وہ ہے دور کتنی  
 جہاں جہاں کے عالم تمام  
 ترا میکہ سا قیا

ابھی آب و گل میں گندھی

اور ابھی پردہ غیب سے جھانکتی یادداشت  
بہت اس نے دیکھے طلوع و غروب

بہت پیشہ ور سپح کا پھیلا ہوا کاروبار

جرائم کہ جن کے تن اور تنے

یہ فنی ہمارت کی اک برتری

اور وہ پاؤں سپر

مکافات کی ان کے سر پر جو رت آگئی

ستوں در ستوں تھا دھنواں اگ رہا

ان کے تھالوں کے بیچ

نتیجہ کی فہرست سے نام کتنے

کہ بخت تھا ڈنکا کبھی جن کا

ہو کر رہے لاپتہ

نہ کوئی دھماکہ نہ کوئی جھماکہ

نہ دنیا داہن

پکڑ کر تھک کر جلائی گئی

قلم کے نوشتہ سے پنپا ہوا خوب زار

وہیں تک ہے سر سبز

کھویا قلم نے جہاں تک نہیں اعتبار  
مگر پاسبان مفادات صید  
قلم نے جہاں لکھ دیا عرف صیاد کا

وہیں شاخ زیتون  
گلدان آرائشی کا اثاثہ بنی

قلم کو بچا  
حرف الحق کی سزا  
بھگتنے کی خاطر سدا  
ساقیا  
سلامت سیوچہ ترا

# قدائیت نمودِ خواب

’فیتلے گل جھڑا بھی دے تمام کا تمام گل‘

’فیتلے تھام خود کو تھام‘

مگر فیتلہ نیم تیرہ دائرہ

کہ کھوہ کھوہ ریگتا ٹوٹتا رہا سبیل

جھت جھت پیسی ہوئی سی راکھ راکھ سہمناک بے تہی

ہراک پکا اضطراب، اضطراب زیر لب کی

ضرب، ضرب رائیگماں

نہ سنگ بستہ خوف کوہ شق نہ دل کو

پیشی

سُلوں کی دار و بست مطلعِ فلق  
تھی وہ بینِ ما و طینِ حرزِ جانِ آدمِ قدیمِ ارتسام  
جس پہ پو پھی

درود

اور درود ہی وہ صخرۂ دوام جس پہ پو پھی  
مطافِ گاہِ طائرانِ آشیل بہ بادِ خانماں بہ بار  
مرحِ سلام  
صحنِ قبلہ گاہ

چمکتے سلسلے سرخ شہیروں کی تازہ کھپ  
پھر انڈیل دی گئی

انڈیل کر بھرا پرادہ دام پھر سبک کند  
پھر سے اک زقند لوٹتی ہوئی ہے بھر رہا  
طویل سایہ شاخصِ نخلِ زار سے کٹے ہوئے وہ پکا  
ڈھیران کا امتیازِ پیرِ خمارِ حلِ رولتا ہوا  
مگر شناخت کے نگیں جڑے وہ تاج  
بر طرازِ آفتاب

ستارے

شوخ و شنگ ان میں پُرِ شباب  
بینش و کنش کے سب کہاں گئے؟

ہزار آلہ کہربا صفت رودں سے لیس ہمسرا نذر کرہ  
 فضاء کے وسط سے وہیں جو جھک گیا تو  
 ناگہاں جھکاؤ کا نہ جانے مدعا ہے کیا  
 نکل کے اس سے چھوٹ سی

حیات اور موت کے تلازمے کی چھوٹ  
 پڑ رہی وہیں ہے اب بھی خاک بینی  
 جہاں تراش ناخنوں کی

اک ہلال ریزہ بھی

قسم اٹھانے کے لئے بچا نہیں

وہ ذی حیات تاب ریزہ دھاریاں  
 بہ کار خویش تیز و تند

تماس میں جو ان کے آگیا وہ چن لیا گیا  
 عذائم شکستہ کی شکستگی سے خستگی سے  
 چور چور

بساط دید اور بھی بسیط اور بھی بسیط

محیط یک نفس سرانگاہ کا

الجھ کے تار تار ان ہمالیہ بدوش غارتوں سے

پے بہ پے اٹھان

جن کی بے ہنوز اب بھی اٹھ رہی



فراز در فراز رنگ پاش روپ کار کوچ  
پھر رہا ہے خود کو پھیرتا ہوا

ہدف ہدف زلال نرم دھوپ سا  
چھلک چھلک کے رچ رہا ہے سلسلے نئے نئے  
تو اتر اس کا گوبخ گوبخ اک سرور  
لالہ لالہ نخرِ حئی لایموت

غیر حئی لاینام

وہ لاشریک اپنے کام میں ہمارے کام بھی  
جو گوندھنے پہ مائل رضا ہوا  
تو گوندھتا چلا گیا وہ بدر کا احد کا کر بلا کا  
اک سدا بہار سلسلہ

تو رمنہ رمنہ جھللاتے اشکِ تاب

پالٹوں میں خواب آ بشار جست

پھولتی شفق کی چوٹیوں کے پار

پل رہے ہیں نعلِ باجنے کا شور

اٹھ رہا ہے دور

ارغنونِ نفس

گہر گہر پسینہ میں پیچھے عتبریں مشام

بٹھ رہے ہیں

گام گام گردنوں پہ سرخیاں گھلا  
زر گداختہ

ڈھلک ڈھلک کے لمعہ بار

تو پھر بتاؤ تازہ دارواں

اصیل

کسی کا رعد در صہیل  
فصیل فیصلہ کے دن کی لانگھنے کو بے قرار

صاحب زمام کے ثبات کا

مثیل کون را ہموار

تو پھر بتاؤ تازہ دارداں درود

ہمہموں بھرا ہے کس کا

زیر ظل عرش زمزموں بھرا

تو پھر بتاؤ انتساب

فتح باب کا قلم ہے لکھ رہا

تو نام کس کا نام جس پہ پو پھیٹی